eISSN: 2791-0342
pISSN:2791-0334

"وزیر خانم" سے "شوکت محل" تک

Transformation of "Wazir Khanum" to "Shoukat Mahal"

Dr Muhammad Shahbaz

Assistant Professor, Department of Urdu

Govt Islamia Graduate College, Civil Lines, Lahore

ڈاکٹر محمد شہباز

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج، سول لائنز، لاہور

Abstract:

In the history of Urdu novel, "Kai Chand They Sar-e-Aasman" by Shamasur Rahman Farooqi holds distinct status in several respects. This novel, in fact is a saga of the decline of Indo-Islamic civilization, in which the writer has revived the characteristics of Indo-Islamic civilization by making a historical figure like Wazir Khanum, the protagonist of the novel. In the light of above said aspect, the scribe, has tried to present the character of Wazir Khanum in the research oriented and critical manner.

Keywords: Wazir Khanum, Akbari Bai, Prostitute, Dag Dehlvi, Marstin Black, Indo-Islamic civilization,

اُردو ناول کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں جن چند ناولوں نے قارئینِ ادب کی بھرپور توجہ سمیٹی، اُن میں شمس الرحمن فاروقی کا ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" بھی شاملِ تحسین رہا۔ یہ نیم تاریخی ناول دراصل اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کا ایک ایسا دل خراش مرقع ہے، جس میں سلطنتِ مغلیہ کے ادبار کو مسلم تہذیب و معاشرت کے زوال کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے اِس ناول کا تانا بانا ناول کے مرکزی کردار، وزیر خانم (۱۸۱۱ء۔۱۸۷۹ء) کی ذات کے گرد بنا ہے، جو نواب مرزا خان داغ دہلوی کی والدہ اور آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے بیٹے میرزا فخرو بہادر کی اہلیہ تھی۔ اِس تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی نے وزیر خانم کی صورت میں ایک تاریخی کردار کو انیسویں صدی کے حسن کا زندہ شاہ کار (Celebrated Beauty) بنا دیا ہے(۱) اور یہ بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وزیر خانم کے کردار کی روشنی میں اُس زمانے کے طور اطوار اور مزاج و مذاق کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔(۲) اِس ضمن میں اطہر فاروقی کی رائے بڑی صائب معلوم ہوتی ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے:

"ہمیں ایک ایسی کہانی عطا کی ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے کچھ پہلے کی دہائیوں کی ہو بہو عکاسی کرتی ہے۔ اس میں مرکزی کردار ایک ایسی عورت کا ہے جو اپنی جائے پیدائش دلی کی مانند توجہ انگیز اور ترغیب آمیز حسن کی مالک، دل موہ لینے والی سرکشی کی حامل، بے ساختہ رِجھانے والی مگر غم کی ماری بدقسمت ہے۔"(۳)

گویا وزیر خانم سے "بہو بیگم"(۴) اور بہو بیگم سے "شوکت محل"(۵) کا مقام حاصل کرنے والی "بچی جان"(۶) اِس ناول کا سب سے دل کش اور مرکزی کردار ہے، جس کی صنّاعی (Craftsmanship) میں شمس الرحمن فاروقی نے اپنی بھرپور توانائی صرف کی ہے۔ ناول کا آغاز ہی وزیر خانم کے تمہیدی تعارف سے شروع ہوتا ہے، جو ماہرِ امراضِ چشم ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کی یادداشتوں سے ماخوذ ہے۔ اِس تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیر خانم کی پیدائش دہلی میں ہوئی اور وہ محمد یوسف سادہ کار کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھی، جس نے زندگی گزارنے کے لیے اپنی راہیں خود متعین کیں۔(۷) مصنف اِس مرکزی کردار کا سراپا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وزیر کا قد اوسط سے ذرا نکلتا ہوا تھا لیکن وہ ایسی بدن چور تھی کہ کپڑے پہن کر بالکل دھان پان لگتی تھی۔ کپڑوں کے بغیر بھی وہ دبلی پتلی لیکن کامنی اور ولاسنی معلوم ہوتی تھی۔ از پیشانی تا چشم و بینی و شفتین، از زنخ تا گردن، از طوق تا ساعد و بازو، از کف دست تا انامل، از شانہ تا ثدی، از شکم تا ناف، از زیر ناف تا کفل، از سرین تاران و ساق، از کعب تا کف پا و انگشت پا، از زلف و گیسو تا سبزۂ تختہ صندل، کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو متوازن، سڈول، اور اپنے موقعے کے اعتبار سے بھاری، باریک، یا تنگ نہ ہو۔ اور نزاکت میں کہیں بھی تقصیر نہ تھی۔"(۸)

وزیر خانم کی پرورش و پرداخت اُس کی نانی اکبری بائی کے عشرت کدے پر ہوئی، جس نے اُسے گانا بجانے کے ساتھ ساتھ وہ تمام گُر سکھائے، جن کی بنا پر کوئی عورت مرد ذات کو تسخیر کرنے میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ دہلی کی مشہور ڈیرے دارنی اکبری بائی کے کوٹھے پر ایک خاص ماحول میں رہنے کی وجہ سے وزیر خانم کی ذہنی ساخت بچپن سے ہی کچھ ایسے سانچے میں ڈھل گئی تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ اُسے کوئی دیکھے، ٹٹولے، اُس کے حسن کی تعریف کرے، اُس کے بدنی خطوط کی گلیوں کے پیچ و خم میں کھو کر رہ جائے، اُس کی ناز برداریاں کرے، اُس کا حکم اُس کا راج ہو۔ اور یہ سارے تقاضے اُسے بھوک کی طرح ستاتے تھے۔ دراصل وزیر خانم کی کردار سازی میں سب سے زیادہ حصہ اکبری بائی کا ہی تھا، جس نے اُسے ایک خود نگر و خود بیں، رعونت پسند اور لامحدود خواہشات (Over Ambitious) رکھنے والی مخلوق بنا دیا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ وزیر خانم کو اُس کی نانی اکبری بائی نے ہی مکمل طور پر پہچانا تھا۔ گویا اکبری بائی جب وزیر خانم کے بارے میں یہ کہتی ہے کہ: "ہاں، تو بہ ہے یہ لونڈیا تو ہتھیلی پر لئے پھرتی ہے۔"(۹) تو مندرجہ بالا دلیل پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وزیر خانم کے مزاج و کردار کو اکبری بائی سے بہتر کسی اور نے نہیں سمجھا۔

اُس کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی، دس گیارہ برس کی عمر میں ہی اُس کے حسن کا شہرہ آس پاس کے علاقوں میں پھیل گیا تھا، وہ رہتی بھی تو ایک ایسی جگہ پر تھی، جہاں ہر کوئی آسانی سے اُس تک رسائی حاصل کر سکے۔ عمر کے تیرھویں برس اُس کے لیے نکاح کے باقاعدہ پیغام آنے لگے تھے۔ نکاح کے علاوہ پابند رہ کر (بے شک اپنے ہی گھر میں) اُس سے تعلق رکھنے والے کسی سے پیچھے نہ تھے، لیکن وزیر خانم کو شادی بیاہ سے سخت نفرت تھی۔ چوں کہ وہ انتہائی خوب صورت خال وخط کی مالک تھی، اِس لیے اُسے اپنی خوب صورتی کا احساس بھی حد سے سوا تھا، یہی وجہ ہے کہ بچپن سے ہی وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی اور اگر یہ کہا جائے کہ "بنی ٹھنی" کی تصویر میاں مخصوص اللہ کی چوتھی نسل، یعنی محمد یوسف سادہ کار کی بیٹی وزیر خانم کا رُوپ دھار کر اِس دنیا میں آئی تھی تو غلط نہ ہو گا۔ بنی ٹھنی کی پریوں کی سی شکل وصورت اور من موہنی کی بد بختی یہ دونوں اکائیاں مرکب ہو کر وزیر خانم کے کردار میں مدغم نظر آتی ہیں۔ بنی ٹھنی کا وجود جو ابھی تک میاں مخصوص اللہ کے مادۂ تولید میں اسیر تھا، تین نسلوں سے ہوتا ہوا چھوٹی بیگم کی صورت میں متشکل ہوا۔(۱۰) اِس ضمن میں سہیل عباس خان رقم طراز ہیں:

"ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بنی ٹھنی کے خمیر سے شمس الرحمن فاروقی نے وزیر خانم کا سراپا اٹھایا ہے۔"(۱۱)

وزیر بیگم نے اپنی بدنی خوب صورتی اور جنسی حرارت کو سب سے پہلے مارسٹن بلیک کے سپرد کیا۔ اِن دونوں کی پہلی ملاقات حوض شمسی کے کھنڈرات میں اُس وقت ہوئی، جب درگاہ فلک بارگاہ سے آتے ہوئے وزیر خانم کی بہلی کا پہیہ ٹوٹ گیا تو اُس مصیبت کے عالم میں جہاں ایک طرف ڈاکو لٹیروں کی آمد کا اندیشہ دامن گیر تھا تو دوسری جانب وزیر خانم کے باپ محمد یوسف سادہ کار کی ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ اس کڑے وقت میں مارسٹن بلیک کی وزیر بیگم پر جب پہلی نظر پڑی تو اُس کی چادر ہوا کے زور سے اُڑ کر اُس کے بدن کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اِن حالات میں بجائے شرمانے، لجانے یا پریشان ہونے کے وہ مارسٹن بلیک میں دل چسپی لینے لگتی ہے۔ وزیر بیگم کے اِس اندازِ دل برانہ سے بہ خوبی واضح ہوتا ہے کہ وہ بہ اعتبارِ مزاج ایک معشوق پیشہ اور آزاد خیال لڑکی تھی:

"اور لالٹین کی کپکپاتی ہوئی لو نے اس کے آپے کو ذرا اور روشن کر دیا تھا۔ انگریز اسے تکتا رہ گیا اور ادھر ایک دلکش غیر مرد کو اپنے میں اس قدر مستغرق دیکھ کر جوانی کی بڑھتی ہوئی موجوں نے کچھ شوخ ہونے کی ٹھانی۔"(۱۲)

وزیر بیگم کا کردار اِس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اُس نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لینے کے باوجود ایک انگریز مارسٹن بلیک کے ساتھ بغیر نکاح کے جنسی وبدنی تعلقات قائم کیے اور دو بچوں مارٹن بلیک اور سوفیہ بلیک کو جنم دیا۔ بغیر نکاح کے ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کے ایک انگریز مرد سے جنسی تعلقات کے حوالے سے شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

"پردہ نشین مسلمان لڑکی جو بظاہر کسبن یا پیشہ ور نچنی نہ تھی، کس طرح اور کیوں ایک انگریز کے تصرف تک پہنچی۔"(۱۳)

"تصرف" کے لفظ میں چھپی حکایت پوشیدہ ہو کر بھی اعلانیہ ہے۔ وزیر خانم بھی اِس بات سے بہ خوبی آگاہ تھی کہ انگریزوں کا مقامی عورتوں کے ساتھ رویہ کچھ اتنا اچھا نہیں ہوتا، تاہم وہ مارسٹن بلیک کے بارے میں پُر اعتماد تھی کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وزیر خانم گو کہ مارسٹن بلیک کے حرم میں بے نکاحی رہ رہی تھی، مگر پورے گھر پر اُس کا حکم چلتا تھا۔ سب سے بڑ کر مارسٹن بلیک نے دیگر انگریزوں یا نوابوں کے انداز میں وزیر خانم کے علاوہ کسی اور عورت کو بہ طورِ سوکن اپنے حرم میں شریک نہیں کیا۔ مزید یہ کہ آپسی گفتگو میں مارسٹن بلیک اسے اپنی منکوحہ بیوی کہا کرتا تھا۔

وزیر خانم نے جب مارسٹن بلیک کے ساتھ اپنی جنسی زندگی کا آغاز کیا تو اُس وقت اُسے نکاح یا تحریری سند کی خواہش تو ضرور تھی اور اِس کا ذکر وہ مارسٹن بلیک سے وقتاً فوقتاً کرتی بھی رہتی تھی، مگر نکاح اُس کے لیے کوئی آخری خواہش کی حیثیت بھی نہ رکھتا تھا۔ وہ بچے پیدا کرنے کے حق میں بھی نہ تھی، بل کہ وہ تو مانع حمل ادویات کی فکر میں رہتی ہے، کیوں کہ اِس بات کا اُسے شدید احساس تھا کہ اُس کا ظاہری حسن و جمال ہی اُس کی اصل طاقت ہے۔ مردوں کی اِسی کمزوری کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرتی ہے۔ وزیر خانم کے کردار کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ مذہبی و اخلاقی اقدار سے بالاتر ہو کر معاشی تحفظ کو اپنی زندگی کے لیے سب سے اہم خیال کیا کرتی تھی۔ اِسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس نے اپنے حسن کو کیش کرانے میں زبردست کام یابی حاصل کی۔ (۱۴)

> "سات ہی آٹھ برس کی تھی جب اسے اپنے حسن، اور اس سے بڑھ کر اس حسن کی قوت، اور اس قوت کو برتنے کے لئے اپنی بے نظیر اہلیت کا احساس ہو گیا تھا۔" (۱۵)

وہ جرنیل اختر لونی، جرنیل پامر اور کرنیل گارڈنر کی بیگمات کا مقام و مرتبہ حاصل کرنے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ اُسے جاہ و حشمت کی بڑی ہوس تھی، یہی وجہ ہے کہ اُس میں طوائفوں کی سی نرگسیت حد سے سوا پائی جاتی تھی۔ انیس برس کی عمر میں دو بچے پیدا کرنے کے باوجود اُس نے اپنا حسن ماند نہ پڑنے دیا تھا۔ یوں بھی وزیر خانم کی ذات مردوں پر راج کرنے کے لیے ہی معرضِ وجود میں آئی تھی اور اِس بات کا بین ثبوت یہ ہے کہ وہ مردوں کو شکار کرنے کے لیے طوائفانہ حربوں اور اداؤں سے بہ خوبی آراستہ تھی:

> "اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ بچوں کی خبر گیری اور اُنھیں دیر تک دودھ پلانے سے اس کے جسم کا کھنچاؤ کساؤ اور سڈول پن اور منھ کی رونق جاتی رہے گی۔" (۱۶)

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات انتہائی قابلِ غور ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے وزیر خانم کے کردار کو کسی قدر تقدیس کے غلاف میں لپیٹ کر پیش کیا ہے۔ جب کہ حالات و واقعات اُسے ایک "کسبی" یا "طوائف" ہونا ہی ثابت کرتے ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ طوائف ہونے کا احساس وزیر خانم کو خود بھی تھا۔ اُسے آغازِ بلوغت سے ہی نکاح سے چڑ تھی۔ اِس حوالے سے وزیر خانم کا انوری بیگم کے ساتھ یہ مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

> "عورت کے لئے مرد ضروری ہے۔ مرد کے لئے عورت ناموس ہے اور عورت کے لئے مرد وارث۔"

"چلیئے، وارث ہی سہی۔ لیکن نکاح تو ضروری نہیں۔"

"تو کیا حرام کاری کرے گی؟ لڑکی خدا سے ڈر۔"

"بس دو بول پڑھ دینے سے جو حرام تھا وہ حلال ہو گیا؟"(۱۷)

فی الاصل شادی یا نکاح کے بغیر عورتوں کا مردوں سے کھلے بندوں اختلاط پیدا کرنے کا منفی رجحان اس تہذیب میں کسی حد تک اپنا وجود تسلیم کروا چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ اُس دور کا سماج اِس منفی قدر کو دل سے قبول کر چکا تھا یا کم از کم اپنے اندر اِس شرعی گناہ کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکا تھا۔ یہ محض ماورائے نکاح جنسی تعلقات کا معاملہ نہیں تھا، کیوں کہ جنسی آسودگی کے لیے مخصوص بازار اور پیشہ ور طائفے موجود تھے، لیکن جنسی تسکین کے لیے اِس بازار کا رُخ کرنے کے بجائے خانگی طور پر کسی عورت کو پابند رکھنے کا مشغلہ نہ صرف رئیسوں اور امیر زادوں کی طبعِ تعیش پسند کی زندگی کا لازمہ تھا، بل کہ اچھے خاصے سنجیدہ مزاج لوگ بھی اِس شوق میں گرفتار تھے اور بہ ظاہر اِس علّت کو طبقۂ اشرافیہ کی تہذیبی اقدار میں غیر اخلاقی حرکت قرار دینے کے بجائے ایک عام رواج اور سماجی ضرورت سمجھ لیا گیا تھا، جس پر انگشت نمائی تک غیر ضروری خیال کی جاتی تھی۔(۱۸) گویا اِس عہد میں بے نکاحی عورتوں کو اپنے حرم میں رکھنا مردوں کے لیے قطعی باعثِ ننگ و عار نہ تھا اور یہ اُس عہد کا وہ کڑوا سچ تھا، جسے اُس سماج نے بہ ہر حال بادی النظر میں قبول کر لیا تھا۔(۱۹)

وزیر خانم خود کو ہر حوالے سے مکمل خود مختار اور آزاد سمجھتی تھی، اِسی لیے شادی اُس کے نزدیک ایک غیر ضروری اور اضافی معاملہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نواب شمس الدین احمد خان کی حویلی میں آ کر وہ نواب شمس الدین احمد خان کی داشتہ بن کر رہ گئی ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اُس نے میر زا تراب علی اور میر زا فخرو بہادر کے ساتھ باقاعدہ رشتۂ مناکحت کا تکلّف بھی کیا، تاہم مارٹن بلیک، سوفیہ بلیک اور نواب مرزا خان داغ کو ناجائز حالات میں ہی جنم دیا، جس کا احساس وزیر خانم کو خود بھی تھا۔ وہ مرزا داغ کو خود بھی نواب شمس الدین احمد خان کی ناجائز اولاد ہی تسلیم کرتی تھی:

"ایسے میں کس دہلوی رئیس کا بوتا تھا کہ وہ نواب شمس الدین احمد کے بیٹے، اور وہ بھی ناجائز بیٹے کو اپنے یہاں نوکر رکھے۔"(۲۰)

وزیر خانم کو دیگر لوگ بھی ایک طوائف کی نظر سے ہی دیکھتے تھے۔ وزیر خانم کے کردار کے حوالے سے زینت محل کا یہ جملہ "انو اسی کا کلیجہ مضبوط ہوتا ہے۔" گہری معنویت کا حامل ہے، جس میں نہ صرف وزیر خانم کا چال چلن، بل کہ اُس کا ماضی کھلی کتاب کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے(۲۱) ذرا یہ مثال دیکھیے:

"تمھارے نواب کہاں سے ہو گئے بیگما۔ تم غیر ذات غیر مذہب غیر گھر کی لگائی جس نے چار پیسے دکھائے اُسی کی ہو رہیں۔"(۲۲)

مذکورہ بالا اقتباسات کو پیش کرنے کے بعد مصنف کی طرف سے وزیر خانم کو ایک مقدس دیوی ثابت کرنے کی کوئی ضرورت باقی رہ نہیں جاتی، یعنی جب وزیر خانم بغیر نکاح کے مارسٹن بلیک کے بچے پیدا کر سکتی ہے، "پابند" ہونے کو معیوب نہیں سمجھتی، ناچ گانا جانتی ہے (یہ الگ

بات ہے کہ اِس کی ضرورت اُسے پیش نہیں آتی) تو پھر اُسے "کسبن" یا "طوائف" کہنے میں اتنا تامل کیوں؟ کیا صرف اِس وجہ سے کہ وہ داغ دہلوی کی والدہ اور مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے خاندان کا پیوند رہ چکی تھی۔ یہ راست ہے کہ وہ روایتی طوائفوں کی طرح ایک وقت میں ایک سے زائد مردوں سے تعلق نہیں جوڑتی یا باقاعدہ کسی خانم کے کوٹھے پر اپنے جسم کی نمائش نہیں کرتی، مگر وہ کام تو وہی کرتی ہے، جو ایک روایتی طوائف سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ اِن حالات میں کیا وزیر خانم کا کردار "امراؤ جان ادا" کے کردار سے مختلف ہے؟ اور پھر جب وہ یہ کہتی ہے کہ نواب شمس الدین احمد خان سے جتنا کچھ اور جو کچھ حاصل ہوتا ہے، اُسے سمیٹ لو تو کیا اُس کا کردار اُس کے طوائف الاصل ہونے کا ترجمان معلوم نہیں ہوتا؟ دراصل بعض عورتیں نوجوانوں یہاں تک کہ شادی شدہ مردوں کی دولت سمیٹنے کے لیے نہ صرف اپنی شہوانی حرکات کو استعمال میں لاتی ہیں، بل کہ اپنا جائز و ناجائز اثر و رسوخ استعمال کر کے اُن مردوں کی میراث تک میں ساجھی دار بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ (۲۳)، جس کی بہترین مثال وزیر بیگم کا کردار ہے۔

بادی النظر میں وزیر خانم پیشہ ور کسبی یا طوائف معلوم نہیں ہوتی، مگر عادات و اطوار سے اُس کا رنڈی ہونا بہ آسانی ثابت ہو جاتا ہے ۔ شمس الرحمن فاروقی نے در پردہ وزیر خانم کو ہر لحاظ سے رکھیل ہی ثابت کیا ہے، مگر کھل کر اُسے طوائف نہیں کہا۔ ایک داشتہ کی اتنی پذیرائی شاید ہی کسی اور ناول میں نظر آئے جتنی کہ اِس ناول میں کی گئی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ شمس الرحمن فاروقی نے وزیر خانم کی شخصیت و کردار کو مصوّر کرنے میں کسی قدر جانب داری سے کام لیا ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

وزیر خانم کا تعلق دراصل اُس تہذیب سے تھا، جس میں عورتیں آسودگی کے زمانے میں بڑے ٹھاٹ باٹھ سے زندگی کیا کرتی تھیں، مگر معیشت کی بدحالی کے بعد یہی عورتیں صبر و تحمل کی نظیر بن جاتی تھیں۔ دلی کی عورتیں جو بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتیں تھیں۔ خاوند کی آدھی کمائی تو ایسی عورتوں نے پان کھا کر تھوک دی، ناآسودہ حالات میں کیا مجال کہ منہ سے اُف بھی نکل جائے۔ سخت معاشی حالات میں بھی اُنھوں نے اپنی آن بان کو برقرار رکھا۔ قرض مانگنے میں اُنھیں عار آتی تھی۔ جو کچھ پڑتی خندہ پیشانی سے برداشت کرتیں۔ (۲۴) اِس کی بہترین نظیر وزیر خانم کا کردار بھی ہے، جو آسودگی و خوش حالی کے بعد نامساعد ادوار میں خود کو اپنے حالات کے مطابق بہ آسانی ڈھال لیتی ہے۔ پھر ایامِ تنہائی میں جب اُسے روزی روٹی کی فکر لاحق ہوئی تو وہ اپنی شرائط پر کسی کی پابند ہونا چاہتی تھی۔ اہلِ ثروت اور اہلِ شہوت اُس کی پل پل کی خبر رکھے ہوئے تھے اور وزیر خانم بھی اپنے آپ کو کسی بیگم سے کم تصوّر نہ کرتی تھی۔ وہ خود کو ذلیل یا سطحی مقام پر لائے بغیر پیسہ کمانا چاہتی تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ زندگی کی تمام لذتوں کو جیسے تیسے حاصل کرنا چاہتی تھی اور پھر یہ صورت ہو جاتی ہے کہ اُسے اپنے حسن و جمال کو اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا پڑتا ہے۔

وزیر خانم کے کردار میں تدریجی اور فطری تبدیلیاں وقت کے ساتھ ساتھ رونما ہوتی رہتی ہیں، یعنی وہ وزیر خانم جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی، اب نواب شمس الدین احمد خان کے مزار پر جاروب کشی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وزیر خانم کی منجھلی بہن کہتی ہے کہ تیر نشانے پر لگا تو وزیر خانم جواب دیتی ہے کہ میں تو دو وقت کی روٹی چاہتی ہوں۔ وزیر خانم شمس الدین احمد خان کی پھانسی کے بعد ذہنی طور پر شکست خوردہ اور مایوس ہو جاتی ہے۔ عورت ہونے کے ناطے حالات کی سختی اُسے بہت کمزور کر دیتی ہے۔ ذرا دیکھیے:

"وزیر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا،" مجھے تو لگتا ہے اللہ میاں نے مجھے ایسے ہی کسی لمحے میں بنایا تھا جب بد نصیب ہی بد نصیب بنائے جا رہے تھے۔"(۲۵)

بچوں کے معاملے میں وزیر خانم کے ساتھ ایک عجیب معاملہ رہا۔ سوفیہ اور مارٹن کو بھی ٹنڈل بھائی بہن اُس سے دور رکھتے تھے، جب کہ آغا محمد شاہ کے معاملے میں پھوپھیا اور نور فاطمہ کا رویہ بھی وزیر خانم کے ساتھ کچھ مختلف نہیں تھا۔ اِسی طرح قلعہ میں بھی خورشید مرزا کو دائیاں سنبھالتیں تھیں۔ وزیر کے اندر ماں کی ممتا ہمہ وقت تڑپتی رہتی ہے:

"وزیر کی آنکھیں بھر آئیں۔" معلوم ہوتا ہے میرا مقدر یہی ہے کہ بچے جنوں اور پھر ان سے ہاتھ دھولوں۔"(۲۶)

وزیر خانم کا رویہ فکری و عملی دونوں سطح پر اپنے وقت سے بہت آگے تھا۔ وہ روایتی اور فرسودہ روایات کی سخت نکتہ چیں تھی اور اِسی روِش کی بنا پر اُس کی ساری زندگی کبھی خوشی کبھی غم کے دو دھاروں میں تقسیم رہی۔ سب سے بڑھ کر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ وقت کے ساتھ ساتھ وزیر خانم کی زندگی سے خوشی کم ہوتے ہوتے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئی۔ اُس کی زندگی میں مارسٹن بلیک، شمس الدین احمد خان، نواب تراب مرزا اور میرزا فخرو بہادر نامی چار مرد داخل ہوئے، مگر اُسے دائمی آسودگی کسی ایک سے بھی حاصل نہ ہوئی۔ اُس کا مستقبل ہر ایک مرد کے ساتھ غیر محفوظ ہی رہا۔ نفی و اثبات، یقین و گمان، بیم و رجا، سراب و حقیقت سائے کی طرح اُس کے ساتھ چمٹے رہے، منزل کی تلاش میں پُر تعیش، مگر سرائے کی مانند کئی سنگِ میل اُس کی عارضی آسودگی کا سامان تو ضرور کرتے رہے، مگر وزیر خانم کا زندگی بھر کا یہ سفر کسی دائمی منزل پر منتج ہونے کے بجائے ناکامی و نامرادی، حزن و ملال، بے چارگی اور بد نصیبی کی تصویر پیش کرتا ہے، مگر اِس کے باوجود شمس الرحمن فاروقی نے وزیر خانم کے کردار کو کچھ اِس مہارت سے تخلیق کیا ہے کہ وزیر خانم کی تمام تر کوتاہیوں اور آزادہ رویوں کے باوجود ہمیں اُس سے ہمدردی اور محبت سی ہو جاتی ہے۔(۲۷)

دوسرے وزیر خانم کا کردار مغل شہنشاہیت کے زوال کا استعارہ ہے، جو ترقی و عروج کی خواہش میں زوال آمادہ ہوتی چلی جاتی ہے ۔ناول کا عنوان بھی مغلیہ سلطنت اور وزیر خانم کی زندگی پر صادق آتا ہے، کیوں کہ منزل حاصل کرنے کے لیے وزیر خانم کی ساری کوششیں نقشِ بر آب ثابت ہوئیں۔ کبریٰ رشید کے خیال میں:

"وزیر خانم کا کردار اس شکست خوردہ تہذیب اور دلی کی مسلمان بادشاہت کا استعارہ ہے۔ جس کے پاس سب کچھ تھا۔۔۔ دماغ تھا، علم تھا، حسن تھا، زندگی گذارنے کے اور سیاست چلانے کے طریقوں سے واقفیت تھی لیکن پھر بھی وزیر خانم اور اسی طرح دہلی کی سلطنت کو شکست پر شکست نصیب ہوتی گئی۔"(۲۸)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وزیر خانم کے کردار میں وہ تمام انسانی کمزوریاں پائی جاتی ہیں، جو لاڈ پیار اور آوارہ ماحول میں پلی ہوئی لڑکیوں میں ہو سکتی ہیں۔ جوانی کے آغاز میں وہ گھر بھر کی لاڈ دلاری، الڑھ، بے پروا، اپنی ہی پرستار اور اپنے ڈھب کی الگ ہی لڑکی

تھی، جس میں سماجی بغاوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ پوری زندگی حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اُس کا مقابلہ کرتی ہے۔ "چمپا احمد" کی طرح گوشہ نشینی اختیار کرنے کے بجائے وہ "انار کلی" کی طرح مظلوم ہو کر بھی ناول کے حالات کے رُخ کو متحرک رکھتی ہے۔ وہ "امراؤ جان ادا" کی طرح اپنے گرد و پیش میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے، مگر دوسروں کے اشاروں پر ناچنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔(۲۹)

بلاشبہ وزیر خانم کا کردار ایک ارتقائی کردار ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ پختہ (Mature) ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ شوخی کی جگہ توازن و اعتدال کا راستہ اختیار کرنے لگتی ہے۔ مارسٹن بلیک کی موت کا غم، بچوں سے جدائی کا غم اور تفکراتِ زمانہ نے کم عمری میں ہی وزیر خانم کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اِسی لیے اِس کردار میں شروع سے آخر تک ایک حزن رچا ہوا ہے اور پورے ناول میں احساسِ محرومی اِس کردار کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ گو کہ اِس کردار کو شمس الرحمن فاروقی نے حصولِ مقصد کا کردار بنایا ہے، مگر اُنھوں نے اِسے بے جان اور کٹھ پتلی نہیں بننے دیا۔ وزیر خانم کے کردار کی صلابت اور بلند حوصلگی ایک چٹان کی طرح ہے، جسے شکست دینا ممکن نہیں۔ بلاشبہ وزیر خانم ایک مکمل، منفرد اور زندہ کردار ہے، جسے مصنف نے طبیعت کی جولانی، تخیل کی تابناکی اور "لطیف ہوس ناکی" سے تخلیق کیا ہے۔(۳۰) مہر افشاں فاروقی کے الفاظ میں:

"Farooqi's novel has made her alive for generations of readers." (۳۱)

مختصر یہ کہ زیرِ بحث ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" کثیر نقطۂ ہائے نگاہ (Multiple point of view) کے بجائے ایک خاص تصوّر میں سمٹا ہوا ہے اور وہ مرکزی تصوّر (Mother Idea) وزیر خانم کی مظلومیت کی ترجمانی اور ہند اسلامی تہذیب کا احیا ہے اور اِسی مرکزی نقطہ کے گرد ساری کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ مصنف نے اِس مرکزی تصوّر کو واضح کرنے کے لیے مسابقت، رقابت اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا نقشہ بڑی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قاری کو اِس ناول کے بعض موڑ یا بعض اہم ترین واقعات فراموش ہو جائیں، مگر یہ بات طے ہے کہ وزیر خانم کا لافانی کردار اُس کے ذہن سے کبھی بے دخل نہیں ہو سکتا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ معید رشیدی، کئی چاند تھے سرِ آسماں: چند باتیں حالیہ تناظر میں، مشمولہ: سہ ماہی آبشار، ۲۰۱۷ء، ص:۱۶۰

۲۔ احمد محفوظ، اُردو کا شاہکار ناول، کئی چاند تھے سرِ آسماں، مشمولہ: نئی کتاب، اپریل، جون ۲۰۰۷ء، ص:۹۱

۳۔ اطہر فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، کی وزیر خانم، مشمولہ: اُردو کراچی، جلد:۹۱، ۹۲، شمارہ:۱۶۔۲۰۱۵ء، ص:۷

۴۔ نواب شمس الدین احمد خان نے وزیر خانم کو "بہو خانم" کا خطاب دیا۔ یہی خطاب نواب شمس الدین احمد خان کے والد نواب احمد بخش خان نے اُن کی والدہ مدی کو دیا تھا۔

۵۔ لال قلعہ دہلی میں مرزا فخرو سلطان سے شادی کے موقع پر بہادر شاہ ظفر نے وزیر خانم کو "شوکت محل" کے خطاب سے نوازا۔

۶۔ وزیر خانم کی منجھلی بہن عمدہ خانم وزیر بیگم کو پیار سے "بچی جان" کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

۷۔ اے خیام، "کئی چاند تھے سرِ آسماں۔ایک تاثر"، مشمولہ: ہم عصر اُردو ناول۔ایک مطالعہ، ترتیب: قمر رئیس، علی احمد فاطمی، اڈیٹر پبلشرز، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص:۲۰۹

۸۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، شہر زاد، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص:۳۳۷

۹۔ ایضاً، ص:۲۸۸

۱۰۔ شاہین مفتی، بنی ٹھنی، مشمولہ: قومی زبان، کراچی، جلد:۷۸، شمارہ:۱۰، اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص:۳۰

۱۱۔ سہیل عباس خان، شمس الرحمن فاروقی کا نیا ناول، مشمولہ: خدا لگتی، مرتبین: لئیق صلاح، ارشاد حیدر، الانصار پبلیکیشنز، حیدر آباد، ۲۰۱۲ء، ص:۶۹

۱۲۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص:۱۴

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۱

۱۴۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص:۲۹

۱۵۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص:۱۶۳

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۸۹

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۷۰

۱۸۔ مظہر جمیل، سیّد، کئی چاند تھے سرِ آسماں، مشمولہ: سمبل، شمارہ:۳، ۴، جلد:۱، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء، ص:۲۷۵

۱۹۔ شگفتہ حسین، وزیر بیگم، کردار نگاری کی ایک مثالی جہت، مشمولہ، معیار، جنوری تا جون ۲۰۰۹ء، ص:۲۳۸

۲۰۔ ایضاً، ص:۶۴۴

۲۱۔ منصور احمد قریشی، ڈاکٹر، کئی چاند تھے سرِ آسماں۔کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر، مشمولہ، راوی، ۲۰۰۸ء، ص:۴۳

۲۲۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص:۶۲۳

۲۳۔ سیمون دی بودا، مترجمہ: یاسر جواد، جنس کی تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص:۳۱۶

۲۴۔ ضمیر حسین دہلوی، سیّد، دلی والے، مشمولہ، دلی کی تہذیب، مرتب: انتظار مرزا، ڈاکٹر، اُردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص:۳۷

۲۵۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص:۶۱۸

۲۶۔ ایضاً، ص:۶۱۷

۲۷۔ حیدر قریشی، حاصلِ مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص:۱۳۴

۲۸۔ کبریٰ رشید، روسی تکنیک کا کامیاب تجربہ، مشمولہ، خدا لگتی، ص:۱۹۹

۲۹۔ ذاکر حسین، کئی چاند تھے سرِ آسماں، نوبل انعام کا مستحق ناول، مشمولہ، خدا لگتی، ص:۴۷

۳۰۔ وحید الرحمن خان، وزیر خانم اور امراؤ جان ادا: تقابلی مطالعہ، مشمولہ، اورینٹل کالج میگزین، جلد:۸۷، لاہور، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء، ص:۱۵۹

۳۱۔ Mehr Afshan Farooqi, Dawn, (September ۱۵, ۲۰۱۳), P.۳